جلد02 شمارہ16، 2023

Article

Prisoners: A Character in the Selected International Fictions

منتخب عالمی افسانے میں قیدیوں کا کردار

Aqsa Shafique[1*], Aqeel U Rehman[2]

[1] Reserch Scholar, Department of Urdu, G. C. University, Faisalabad.

[2]Ph.D Scholar, Department of Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan.

*Correspondence: aqsashafique98@yahoo.com

اقصیٰ شفیق[1*]، عقیل الرحمٰن[2]

[1] ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، [2]پی ایچ ڈی سکالر، شعبۂ اُردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

Abstract: Many Fictions have been written in the literature world. Plenty of fiction writers wrote about prisoner characters. One of the bitterest experience is the life of prisoners. Naturally, human loves a life of freedom. He certainly, does not like to live a life within the confines of a few boundaries. Prison does not always belong to some crime, it sometimes may be due to false blame. Some people are imprisoned even if they are free, such prison belongs to their mental imprisonment. Locking yourself in a room or corner is also very painful. Suffering from mental torture and living like slaves is also a sort of prison. In the current article, those fictions have been reviewed which have been focusing on the painful lives of prisoners. Such fictions include "Ward No.6" by Chekhov, "Mujrim" by guy de Maupassant, "Deewar" by Jean Paul Sarter and "Thank you Mr. Gillard" By Anil Broye.

Keywords: Prisoner's character, Mental patient, Fear, Ward number 6, Horrible prison, undefendable prisoner, freedom-lover prisoner, Mr. Gillard, Revolutionary prisoner.

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:04-09-2023
Accepted:19-11-2023
Online:20-12-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

عالمی سطح پر اہلِ قلم نے جن کرداروں کے ذریعے زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کی تصویر کشی کی ہے، ان میں قیدیوں کے کردار نمایاں ہیں۔ یہ کردار عام سماجی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اُن عالمی تحریکوں سے متعلق بھی ہیں جن سے وابستہ افراد آزادی یا انسانی حقوق کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ عالمی ادب کے موضوعات وہاں کی تحریک سے متعلق ہوتے ہیں۔ عالمی ادیبوں نے وہاں کے معاشی و سماجی حالات کو بیان کیا ہے۔ انسانی فطرت کی منفی صفات کو اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنا کر پیش کیا ہے اور اس پر طنز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مفلس، بے چارگی، غربت کو بھی اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنایا ہے اور اُن مفلس، لاچار، مجبور اور بے سہارا کرداروں کا خاص طور ذکر کیا ہے، جو ظالم سماج کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور مشکلات کی چکی میں پستے ہوئے اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ یورپی افسانہ نگاروں نے وہاں موجود قید خانوں کے حالات پر واضح روشنی ڈالی ہے اور ان کرداروں کا بھی خاص ذکر کیا ہے جو جیل کی سلاخوں میں قید ہیں اور ان کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا جارہا ہے۔

اس سلسلے میں چیخوف کا افسانہ ''وارڈ نمبر ۶'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چیخوف اپنے اس افسانے کے آغاز میں پانچ ذہنی مریض قیدیوں کا ذکر کرتا ہے جو ایک ہسپتال کے احاطے میں ایک چھوٹی سی عمارت میں بند ہیں اور ان پر ایک پہرہ دار بوڑھا سپاہی نیکیتا ہے جو بہت ہی ظلم و جبر کا مظاہر کرتا ہے۔ ان ہی قیدیوں میں ایک موئے سینکما ہے جو باہر بھیک مانگنے جاتا ہے لیکن نیکیتا اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ انہی میں ایک ایوان دمیترچ ہے جو مصنف نے اہم قیدی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایوان دمیترچ اعلیٰ طبقے کا آدمی ہے۔ اس کا باپ گروموف ایک سرکاری افسر تھا لیکن ان پر جعل سازی اور غبن کے الزام لگا کر قید خانے میں داخل کر دیا گیا جو جلد ہی وہیں وفات پا گیا پھر ایوان جو اس وقت یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے لیکن گھریلو حالات خراب ہونے کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دیتا ہے اور اپنے قصبے میں بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔ دستاویزات کی نقلیں تیار کرتا ہے لیکن پھر بھی گزارا نہیں ہوتا۔ پھر وہ عدالت میں حکم نامہ بھیجنے پر ملازمت کرتا ہے ایوان کا قصبہ بہت ہی خرابیوں کا شکار ہے جس میں ظلم و ستم، ناانصافی، دہشت گردی، قتل و غارت کے سائے منڈلا رہے تھے اور وہ خود ان سے خوف زدہ بھی رہتا ہے۔ ایوان دمیترچ ایک غور و فکر کرنے والا شخص ہوتا ہے جو ہر وقت حالات کے بارے میں نظریات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ایک دن وہ گھر سے عدالت کی طرف جارہا تھا کہ اس نے دو پولیس والوں کو دیکھا جو قیدیوں کو پکڑ کر لے جارہا ہے۔ ان سے خوف زدہ ہو کر وہ گھر جا کر سوچنے لگا کہ اس سے بھی کوئی غیر ارادی طور پر جرم سرزد ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے قصبے کے بارے میں دہشت گردی اور قتل و غارت کے سنگین ترین جرم کے بارے میں سب سن چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھ سے بھی اس طرح کے جرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ چیخوف کے افسانے ''وارڈ نمبر ۶'' میں سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"خزاں کی ایک صبح کو ایوان دمیترچ اپنے کوٹ کا کالر کھڑا کیے ہوئے کیچڑ دار جگہوں اور عقبی احاطوں سے گزرتا ہوا عدالت کے حکم کی تعمیل کے لیے کسی کے ہاں جا رہا تھا۔۔۔ایک گلی میں اس کا سامنا چار مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں جاتے ہوئے دو قیدیوں سے ہوا جن کے ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔۔۔جانے کیوں اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ خود اسے بھی ہتھکڑی پہنا کر انہی قیدیوں کی طرح کیچڑ دار سڑکوں سے قید خانے لے جایا جا سکتا ہے۔"[۱]

ایوان دمیترچ غور و فکر کرنے لگا کہ کہیں اسے بھی قاتل سمجھ کر گرفتار نہ کر لیا جائے۔ اس طرح ایوان ذہنی طور پر خوف زدہ اور اضطراب کا شکار رہنے لگا اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ کوئی بھی شخص اس کے پاس سے گزرتا تو اس سے خوف محسوس کرتا کہ کہیں یہ کوئی مخبر نہ ہو۔ ایک رات اس کی مالکن کے کچھ رشتہ دار لوگ آئے تو ایوان دمیترچ ان کو پولیس والے سمجھ کر گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اس کو گھر لایا گیا اس کا ڈاکٹر اندریئ یفیمچ نے چیک اپ کیا اور اسے ذہنی مریض سمجھ کر ہسپتال میں وارڈ نمبر ۶ میں قید کر دیا۔ جہاں دوسرے ذہنی مریض بھی شامل تھے۔

چیخوف نے ڈاکٹر اندریئ یفیمچ کو اس افسانے میں ایک مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور پورا افسانہ اس کی کہانی پر مرکوز ہے۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ شروع میں جس ہسپتال میں آتا ہے اس کی حالت بہت ہی خستہ حال ہے۔ ہسپتال کا عملہ اور ڈاکٹر سمیت سب کرپٹ ہیں وہ مریضوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے نہ ہی ان کی طرف کوئی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اندریئ شروع شروع میں مریضوں کی خوب دیکھ بھال کرتا ہے۔ ان کا باقاعدگی سے چیک اپ کرتا اور ان کا آپریشن کرتا ہے لیکن آخر کار یہ بھی ان سے بد دل ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر زندگی کا انجام موت ہے تو علاج سے کیا فرق پڑ سکتا ہے آخر اگر کوئی دس بارہ برس کی زندگی حاصل کر لیتا ہے تو اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ دوائیوں سے تکالیف دور کر کے کیا ہو گا بلکہ تکلیف سے انسان میں کاملیت پیدا ہوتی ہے اگر دوائیوں اور سفوف سے تکلیف کا علاج ہو بھی جائے تو لوگوں کا مذہبی عقائد سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اسی وجہ سے اس نے ہسپتال میں جانا کم کر دیا اور جاتا بھی تو بہت ہی کم لوگوں کو چیک کرتا اور واپس گھر آ کے کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ ایک دن وہ ہسپتال سے واپسی پر گھر آ رہا تھا کہ موئے سینکما بھیک مانگ رہا تھا ڈاکٹر کو کہا ایک کوپیک دے دو۔ ڈاکٹر نے اس کو دس کوپیک دیے اور دیکھا کہ اتنی سردی میں اس کا جسم ننگا ہے اور پاؤں برہنے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کا پیچھا کرنے لگا جب وہ ہسپتال کے وارڈ نمبر ۶ میں داخل ہوا تو ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ ہی داخل ہو گیا اس کی ملاقات ایوان دمیترچ سے ہوئی۔ ڈاکٹر کو اس

کی گفتگو میں جذباتیت نظر آئی اور اس کو یہ آدمی غور و فکر کرنے والا شخص نظر آیا۔ چنانچہ وہ ہر روز اس کے پاس جاتا اور وہ دونوں مختلف نظریات پر بحث کرتے تھے۔

ڈاکٹر اندریئی یفیمچ دراصل غور و فکر کرنے والا ایوان دمیترچ کی طرح کا ایک انسان ہے جو اپنے قصبے سے بد دل ہو گیا ہے وہ لوگوں کی تنگ نظری، تعصب اور جہالت سے پوری طرح آگاہ تھا وہ کہتا تھا کہ قصبے میں ایک شخص غور و فکر یا دانش مندانہ خیالات کا حامل نہیں ہے جو اس قسم کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ ذہن کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرتا تھا کہ ذہن انسانی کے اعلیٰ وارفع روحانی اظہارات کے سوا دنیا کے ہر شے غیر اہم ہے۔ یہ ذہن ہی ہے جو انسان اور حیوان میں فرق ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذہن اور غور و فکر کرنے والے دانش مندوں کو اپنے خیالات کے اظہار میں اپنے جیسے غور و فکر کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ ایک پنجرہ میں بند رہتے ہیں۔ وہ ایک گھٹن کا شکار رہتے ہیں یہ آپس میں مفید خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر انسان جاوداں کیوں نہیں ہے۔ آخر ذہن اور بصارت، گویائی اور خود آگاہی کا وجود کیوں ہے۔ آخر ایک دن ان سب کو خاک میں مل جانا ہے اور کسی مقصد کے بغیر ہی آفتاب کے گرد چکر لگاتے رہنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آخر انسان کو موت کیوں آتی ہے اس کو بھی اس کے ذہن کی طرح جو اس کے نظریات ہوتے ہیں اس ماحول میں گردش کرتے رہنا چاہیے۔ دراصل وہ موت پر یقین ہی نہیں رکھتا ہے۔

ایک دفعہ اس کی ملاقات وارڈ نمبر ۶ کے قیدی ایوان دمیترچ کے ساتھ ہوتی ہے تو ڈاکٹر اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوتا ہے اور وہ مختلف موضوعات پر بحث و تکرار کرتے ہیں۔ اس طرح ہسپتال کا عملہ اور خود ڈاکٹر بھی اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو ذہنی مریض سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر خوبوتوف اس کی دیکھ بھال کے لیے گھر جاتا ہے وہ سب اس کو بھی وارڈ نمبر ۶ میں ذہنی مریض سمجھ کر داخل کروا دیتے ہیں۔

کسی بھی تخلیق کے پیچھے ایک ادیب سے زیادہ اس عہد کے معاشرے کا ہاتھ ہوتا ہے ہر تخلیق اپنے عہد کے معاشرے کی عکاس ہوتی ہے۔ معاشرے اور ادیب کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ معاشرہ ادیب تخلیق کرتا ہے۔ ادیب کی معاشرے پر گہری نظر ہوتی ہے اور اپنی سوسائٹی میں پائے جانے والے موجودہ حالات کو اپنی تخلیق کے ذریعے منظر عام پر لاتا ہے اور معاشرے میں پائے جانے والی برائیوں کو اپنی تخلیق میں موضوع بنا کر زیر بحث لاتا ہے اور وہ سوسائٹی میں کسی بھی موضوع پر ہونا چاہیے وہ معاشرتی، سماجی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، ہو یا نظریاتی اپنی تخلیق میں اس برائی کو واضح طور پر کہانی کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

ہر ادیب کی تخلیق کے پس پردہ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ چیخوف نے بہت سے افسانے لکھے۔ جن کا مقصد اپنے معاشرے کی برائیوں کو مد نظر رکھ کر منظر عام پر لا کر اس برائیوں کو ختم کیا جائے ان کے افسانوں میں ناداری، مرض لاعلاج، تلاش، اپنے خول کے اندر آدمی، دکھ، گرگٹ، نقلی چہرہ، سچے لوگ، وارڈ نمبر ۶، یہ وہ موضوعات ہیں جو چیخوف نے روس کے اندر اپنے عہد میں معاشرے کے اندر بدلتے ہوئے حالات جن میں دہشت گردی، آوارہ پن، قتل وغارت، تنگ نظری، پاگل پن، نظریاتی سوچ رکھنے والے لوگ، رشوت خوری، ظلم وجبر اور تشدد کو بھرپور انداز میں منظر عام پر لایا۔

چیخوف کے افسانوں میں شامل افسانہ وارڈ نمبر ۶، کا فکری حوالے سے جائزہ لیا جائے تو اس افسانے میں چیخوف نے اپنے معاشرے کی بہت سی برائیوں کو کرداروں کے ذریعے پیش کیا۔ ان میں کچھ معاشرتی، سیاسی، نظریاتی اور مذہبی نوعیت کی ہیں۔ چیخوف نے اپنے افسانے کے آغاز میں پانچ ذہنی مریضوں کا تذکرہ کیا ہے جو ایک وارڈ میں قید ہیں، جو اپنے معاشرے کے ظلم و جبر، تشدد، قتل وغارت اور ناانصافی اور دیگر انسانی شکوک وشبہات کا شکار ہیں اور ذہنی مریض بن چکے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس سے کچھ حصہ لیا گیا ہے جس سے بات واضح طور پر بیان کی جاسکتی ہے۔

> "پلنگوں کے پائے فرش میں جڑے ہوئے ہیں اور ان پر اسپتالی لبادے اور رات کو سوتے وقت استعمال کرنے کی قدیم طرز کی ٹوپیاں پہنے ہوئے لوگ بیٹھے یا لیٹے ہیں یہ سب دماغی مریض ہیں۔"(2)

اسی وارڈ نمبر ۶ میں ایک ذہنی مریض موئے سینکما موجود ہے اس کو اس وارڈ سے باہر نکلنے کی اجازت ہوتی ہے اور اس وارڈ کا ایک سپاہی پہریدار نیکیتا ہے، جو ذہنی مریضوں کی ذرا سی غلطی پر ان کو اِنتہا درجے کا ظلم وستم کا نشانہ بناتا ہے، جب موئے سینکما بھیک مانگ کر آتا ہے تو یہ گھٹیا پہرے دار اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے اور اسے وارڈ میں بند کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں اِقتباس ملاحظہ ہو:

> "کہیں اسے "کواس" پینے کو مِل جاتا ہے تو کہیں روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک کوپیک اور وہ مال دار اور مطمئن ہو کر واپس آجاتا ہے پر وہ جو کچھ بھی لاتا ہے اسے نیکیتا چھین لیتا ہے۔"(3)

اس اقتباس میں چیخوف معاشی حوالے سے ایک معاشرتی برائی کو منظر عام پر لایا ہے۔ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ہوتے جو اپنی دولت سے غیر مطمئن ہوتے ہیں اور دوسروں کا بھی مال ہڑپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس قدر ظلم وستم اور

جبر کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ایک بھکاری تک کو مغلوب کرتے ہیں اور اس سے سب سکے چھین لیتے ہیں۔ چی خوف نے اپنے معاشرے میں بڑھتی ہوئی دولت کی ہوس کو اُجاگر کیا ہے۔

اس افسانے میں ایک اہم ترین کردار ایوان دمیترچ جو معاشرے کے ظلم و جبر کا شکار ہے۔ وہ ایک غور و فکر کرنے والا انسان ہے اور ایک یونیورسٹی کا طالبِ علم ہے لیکن گھریلو حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ وہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات، جن میں کمینہ پن، سفلی پن، ظلم و بربریت کا بازار گرم تھا۔ اسے ان امور کا سوچ کر یہ خیال آتا ہے کہ کسی طرح غیر اِرادی طور پر میں بھی اس جرم کا اِرتکاب نہ کر بیٹھوں اسی طرح کے خیالات سوچ سوچ کر وہ ایک ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ وہ اپنے قصبے کے بارے میں مختلف نظریات رکھتا ہے جو اِس اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔

> ”ہمارے قصبے کے ماحول میں بڑی گھٹن ہے۔ زندگی بے کیف ہے۔ اعلا و ارفع دلچسپیوں سے یکسر خالی معاشرہ اپنے بے جان، بے معنی وجود کو جوں توں برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں جان بھی پڑتی ہے تو صرف تشدد سے واہیات قسم کی عیاشی اور مکاری ہے۔ بے ایمان گلچھرے اُڑاتے ہیں، ایمان دار روز کنواں کھودتے، روز پانی پیتے ہیں یہاں ضرورت ہے اسکولوں کی، ایک ترقی پسند مقامی اخبار کی۔“(4)

ایک اعلیٰ فنکار ادیب وہ ہوتا ہے جو اپنی تخلیق میں بات کو واضح طور پر بیان کر سکے اور اس بات کو ادیب اپنی تخلیق میں کرداروں کا سہارا لے کر اپنی بات کو پیش کرتا ہے۔ اس اِقتباس کو چی خوف نے ایک کردار کے ذریعے پیش کیا ہے کہ یہ تمام بُرائیاں ایک معاشرے کے لیے ناسور ہیں۔ اس سب سے پہلے ادیب ان پہلوئوں کو زیرِ بحث لاتا ہے، جن میں تعصب، تنگ نظری اور جہالت جس معاشرے میں ان چیزوں کا بول بالا ہو وہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب معاشرے کے اندر روشن خیالی نہ پائی جائے تو اس کے اندر خیالات کا جمود رہتا ہے اور اس معاشرے کے اندر شکوک و شبہات والی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک مثالی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ جس معاشرے میں عدل و اِنصاف کا خون کیا جا رہا ہو اور ظلم و تشدد ہر جگہ موجود ہو جس میں مکاری، عیاری اور عیاشی پائی جائے وہ معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے اور جہاں ایمان کی جگہ بے ایمانی لے لے اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو جہاں عدل و اِنصاف کو پسِ پردہ ڈال دیا جائے وہ معاشرہ کبھی بھی ایک مثالی نمونہ کا رُوپ اختیار نہیں کر سکتا۔ چیخوف کے نزدیک ان تمام برائیوں کے خاتمے کے لیے تعلیم کی طرف توجہ مرکوز کی جائے اپنے تنگ نظری کو دُور کر کے روشن خیالی اپنانی چاہیے اور ترقی پسند افکار کو جنم دینا چاہیے اور اس معاشرے میں ترقی پسند ادب کو تخلیق کرنا چاہیے تاکہ لوگوں

کے اندر شعور پیدا ہو اور وہ راہنمائی حاصل کر سکیں اور اس میں پائے جانے والے فلسفی کو آپس میں خیالات کا تبادلہ کرنا چاہیے اور اپنے افکار کو معاشرے سے آشکار کیا جائے۔

اس افسانہ میں چی خوف نے ایوان کو ایک ایسے کردار کے رُوپ میں پیش کیا جو اپنے قصبے کے لوگوں سے بد ظن ہے، جنھوں نے اس کے باپ پر جعل سازی اور غبن کا الزام عائد کر کے اس کو قید کر دیا جہاں وہ وفات پا گیا۔ اس کا باپ ایک سرکاری ملازم تھا جو پولیس والوں اور ججوں نے رسمی کارروائی کر کے اس کو سزا سنا دی اور مقدمہ کی گہرائی تک نہ دیکھا اور انسانی ہمدردی کو بالا طاق رکھ کر صرف اس کو سرکاری امور کے نقطہ پر سزا سنا دی۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایوان دمیترچ نامی ایک ایسے قیدی کے کردار کو واضح کیا ہے، جو یونیورسٹی کا طالبِ علم تھا لیکن اِرد گرد کے ماحول کا اُس نے اپنے ذہن پر اس قدر اثر کیا کہ وہ ہر چیز سے خوف زدہ رہنے لگا اور اسے اپنے ذہنی اعصاب پر اس قدر سوار کر لیا کہ وہ ذہنی مریض بن گیا۔ اِرد گرد کے لوگوں نے اسے ذہنی مریضوں کے ہسپتال، وارڈ نمبر ۶ میں داخل کر دیا۔ کہنے کو تو وہ پاگلوں کی وارڈ تھی جہاں ممکن تھا کہ ذہنی مریضوں کا علاج کیا جائے، لیکن وہ مریضوں کے لیے قید تھی وہ قید جہاں نارمل انسان بھی ذہنی مریض بن جائے اور پاگل تو ویسے ہی اور پاگل ہو جائے۔ کوئی بھی نہیں تھا مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔ ایوان دمیترچ صحیح تھا صرف دُنیا سے ڈر اور خوف کھاتا تھا لیکن اُس قید میں وہ بے حد اذیت میں مبتلا تھا۔ ہر لمحے اُسے باہر نکلنے کا خیال رہتا۔ اُسے وہاں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ بس ایک چھوٹی تنگ و تاریک کوٹھری تھی وہ وارڈ نمبر ۶، جہاں دو قدم اُٹھ کر چل لینے کے بعد پھر واپس اپنے بیڈ پر بیٹھ جانے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ تو یہ زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ اذیت ناک قید خاموشی، تنہائی جہاں اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اب یہاں سے کبھی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔ موت ہی اسے یہاں سے نکال سکتی ہے لیکن وہ تو حیاتِ ابدی پر یقین رکھتا تھا اسے اور جینا تھا ایک پُر سکون زندگی کے ساتھ لیکن وارڈ نمبر ۶ میں اسے ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس کے ساتھ چیخوف نے اس افسانے میں ایک اور ایسے قیدی کے کردار کو نمایاں کیا ہے جو لوگوں کے ظلم و جبر کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ وارڈ نمبر ۶ کا بھی شکار ہو گیا اور دُنیا کی ظلمت اور وارڈ نمبر ۶ کی قید نے اس کی جان تب ہی چھوڑی جب اس نے دُنیا چھوڑ دی۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ نام کا وہ قیدی جو ذہنی مریضوں کے ہسپتال کا ڈاکٹر تھا اور کبھی کبھی وارڈ نمبر ۶ میں موجود مریضوں کو بھی دیکھنے آتا تھا۔ ایوان دمیترچ سے ملنے اور اس سے بات کرنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس جیسی سوچ رکھنے والا کوئی شخص اُسے مِل گیا ہے۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ کے چونکہ اور بھی بہت سے دوست احباب تھے، لیکن ایوان دمیترچ سے باتیں کر کے اسے بہت ہی اچھا محسوس ہوتا وہ زیادہ وقت یا تو تنہائی میں رہنے کا عادی تھا، یا پھر ایوان دمیترچ کے پاس وارڈ نمبر ۶ میں آ کر اس سے باتیں کرتا۔ ایوان دمیترچ اسے بتاتا کہ وارڈ نمبر ۶ قید ہے۔ اذیت ناک قید جہاں زندگی بالکل زندہ لاش کی طرح

گزر رہی ہے۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ اُس سے باتیں کر کے بہت ہی اچھا محسوس کرتا لیکن اُس اذیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جس اذیت سے ایوان دمیترچ گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ تنہائی میں اپنا وقت گزارنے کے بعد ایوان دمیترچ سے ملنے وارڈ نمبر ۶ میں آجاتا اور گھنٹوں اس سے گفتگو کرتا رہتا۔ اپنے دوست احباب کے ساتھ بات کر کے اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ اس لیے وہ سب سے کٹ کر ایوان کے پاس ہی آجاتا اور ہر وقت اس سے محوِ گفتگو ہوتا تو اس میں بُرائی کیا تھی یہ کہ وہ ایوان دمیترچ کے پاس آکر اُس سے بات کرتا ہے جو وارڈ نمبر ۶ میں قید ہے یا یہ کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر کا مریض سے یوں بے تکلفی سے بات کرنا درست نہیں۔ وارڈ نمبر ۶ میں تعینات نیکیتا اور بہت سے ڈاکٹروں نے اندریئ یفیمچ پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ اس کے بارے میں باتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اندریئ یفیمچ کے اپنے عزیز دوست میخائل اویریانچ نے اور ایک اور ڈاکٹر خوبوتوف نے اُسے بھی وارڈ نمبر ۶ میں قید کر دیا یہ سمجھ کر کہ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ پاگل ہو چکا ہے اور اسے علاج کی ضرورت ہے، لیکن وارڈ نمبر ۶ تو وہ قید تھی جہاں علاج نہیں ہوتا تھا بلکہ انسان کی باقی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وارڈ نمبر ۶ میں اسے گھٹن محسوس ہوتی اس دو گز کی کوٹھری میں چلنے کے لیے جگہ ہی کہاں تھی۔ اس نے جو باہر جانے کی ضد کی تو نیکیتا نے اس کا راستہ روک لیا۔ ڈاکٹر کے بار بار اصرار کرنے پر بھی نیکیتا نے ایک نہ سنی۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ نے جو زبردستی کی تو نیکیتا نے اُن پر ظلم ڈھانا شروع کر دیے۔ ڈاکٹر اندریئ یفیمچ کو اتنا مارا کہ اُن کے منہ سے خون نکل پڑا دو دن بیہوش رہنے کے بعد جب انھیں ہوش آیا تو پھر وہی قید، وہی گھٹن، وہی اذیت ناک زندگی۔ اس چیز کا اُن کے دماغ پر اس قدر اثر پڑا کہ دماغ کی نسیں پھٹ گئیں، جس کی وجہ سے ڈاکٹر اندریئ یفیمچ کی موت واقع ہو گئی۔

زمانے کے ظلم و ستم، ناانصافیوں اور شک نے ڈاکٹر کو بھی نہیں سکون سے جینے دیا یعنی ایک نارمل شخص کو ابنارمل بنا کر اُسے قید کر دیا اور اسی معاشرے نے ایوان دمیترچ سے بھی اُس کی سکون کی زندگی چھین لی۔

ایک اور عالمی افسانہ نگار گاءیڈی موپساں Guy de Maupassant کا ایک افسانہ ''مجرم'' بھی قیدی کرداروں سے متعلق ہے۔ اس افسانے میں ایک بے کس، مجبور اور لاچار قیدی کی کہانی کو انہوں نے بیان کیا ہے۔ اس کی زندگی میں اُس کے ساتھ پیش آنے والے حادثات، لوگوں کا اُس کے ساتھ رویہ، بدسلوکی، جیل میں قید ہونا اور آخر میں موت بہت ذلت آمیز ہے۔

وہ پندرہ برس کا تھا جب مارول کے پہاڑی راستے میں ایک گاڑی کے نیچے آکر اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ معذوری، لاچاری اور بے بسی میں ہی اُس کی ساری زندگی گزر گئی۔ معذوری کی وجہ سے وہ کوئی کام نہ کر سکا البتہ بھیک ہی صرف مانگ سکتا تھا۔ لوگوں کے گھر گھر جا کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ گزشتہ چالیس برسوں میں وہ اپنی لکڑی کی بیساکھیوں کو گھسیٹتا ہوا دیہات میں موجود ہر ایک کے گھر جا کر بھیک مانگا کرتا تھا لیکن لوگ اس کی ذرا بھی مدد نہیں کرتے بلکہ اسے دھرتی پر بوجھ سمجھتے۔ گھر کی عورتیں

اسے ہر وقت لعن طعن کرتی رہتیں اور اسے کچھ نہ دیتیں۔ لوگ اسے بد معاش، آوارہ، نکما کہہ کر بلاتے۔ لوگوں نے اس کا نام گھنٹی رکھا ہوا تھا کیونکہ اس کا پورا جسم دونوں بیساکھیوں کے درمیان گھنٹی کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں موپساں لکھتے ہیں:

"وہ جنگلی جانوروں کی سی زندگی گزار رہا تھا کہ زندگی اسے گزار رہی تھی۔ اس سے کوئی ملنے کی کوشش ہی نہ کرتا تھا۔ کسانوں کے دلوں میں اس کے لیے نفرت اور ان کے رویوں میں ہتک تھی وہ اسے "گھنٹی" کہتے تھے کیونکہ اس کا جسم دو بیساکھیوں کے درمیان گھنٹی کی طرح لٹکا رہتا تھا۔"(5)

یہاں تک کہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے اسے یہاں سے چلے جانے کو کہتے لیکن وہ کہاں جاتا اسے اس گاؤں میں جدھر وہ رہتا تھا کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دروازے کے پاس سے اُٹھ کر کبھی دوسرے دروازے کے پاس چلا جاتا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ البتہ سردیوں میں وہ کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور کئی کئی دن وہاں ہی پڑا رہتا۔ موپساں اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

"اس کا کوئی ٹھکانہ یا سر چھپانے کے لیے کوئی چھت نہ تھی اس کی کوئی باقاعدہ پناہ گاہ نہیں تھی موسم سرما میں وہ بڑی ذہانت سے کام لیتے ہوئے باڑوں یا اصطبلوں کے اندر جگہ بنا لیتا تھا اس سے پہلے کہ کوئی اسے تلاش کرے وہ وہاں سے چلا جاتا۔ کونوں سوراخوں اور درزوں میں گھس جاتا اور کئی کئی دن تک وہیں پڑا رہتا۔"(6)

وہ جانوروں کی سی زندگی گزار رہا تھا کوئی اس کا ساتھی نہ تھا کوئی بھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔ لوگ ہر وقت اسے لعن طعن کرتے رہتے اور اسے گاؤں چھوڑ جانے کو کہتے۔ لیکن اسے سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کہاں جائے۔ ایک دن دسمبر کی سخت سردی میں وہ بھوک سے نڈھال ہو کر کسی جگہ ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اسے صرف ایک ہی چیز کی تمنا تھی اور وہ تھا کھانا کیونکہ وہ دو تین دن سے مسلسل بھوکا تھا اور کسی نے بھی اسے کچھ نہ دیا تھا۔ ہر ایک سے اسے دھکے ہی ملے۔ ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے اسے ایک کسان شیکا کی مرغیاں باہر پھرتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ ان میں سے ایک کو بھون کر کھایا جائے چنانچہ اس نے پتھر مار کر ایک مرغی ہلاک کر دی۔ اس سلسلے میں اس افسانے میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ انہیں سرسری طور پر دیکھ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھون کر کھایا جائے تو کتنا مزہ آئے گا۔۔۔ اسے اس بات کا بالکل احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی جرم کر رہا ہے۔"(7)

وہ ابھی اُس کے گوشت کو دیکھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے شیکا کسان نے اسے زوردار مکا مارا اور اسے نیچے گرا دیا۔ باقی کسانوں نے بھی آکر اس کی خوب پٹائی کی۔ جب وہ مار چکے تو اسے ایک کوٹھری میں بند کر کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے اُسے پکڑ کر جیل میں قید کر دیا۔ وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ لوگوں کی مار اور پولیس کے خوف کے ساتھ ساتھ بھوک نے اسے بالکل نڈھال کر دیا۔ یہاں تک کہ اگلے روز پولیس جیل میں اس سے تفتیش کرنے آئی تو وہ مر چکا تھا۔ اس سلسلے میں موپساں یوں لکھتے ہیں:

"اگلی صبح جب وہ مجرم سے تفتیش کرنے کے لیے کوٹھری میں آئے تو وہ فرش پر مردہ پڑا تھا۔ ایک حیران کر دینے والی چیز کی طرح۔"(8)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو واضح کیا ہے اور ایک بے کس، مجبور، بے سہارا، لاچار اور بے زبان قیدی کے کردار کو واضح کیا ہے۔ جو زندگی نہیں گزار رہا تھا بلکہ زندگی اسے گزار رہی تھی۔ لوگوں میں ہمدردی دیکھنے کو نہیں تھی۔ وہ معذور تھا کما کر کھا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے دنیا نے اسے بوجھ سمجھنا شروع کر دیا۔ بھیک میں روٹی کا ایک ٹکڑا دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ مرغی کو ذبح کرنا بھی کوئی جرم ہے اگر دیکھا جائے تو لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر بہت بڑے بڑے جرائم کر لیتے ہیں اور معاشرے میں سرعام گھوم رہے ہوتے ہیں۔ کوئی قانون انھیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تو پھر غریب ہی کیوں ہمیشہ پھنستا ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا پر بوجھ ہے۔ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس لیے معاشرہ بھی بے رحم اور ظالم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے جینے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ اس بے زبان، مظلوم، بے سہارا قیدی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ ایک مرغی کو ذبح کرنے پر لوگوں نے اسے بہت مارا اور پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔ مرغی کو پتھر مار کر ذبح کر دینا لوگوں کے نزدیک بہت بڑا جرم ہو گیا کہ پولیس نے بھی انصاف نہ کیا اور اسے جیل میں قید کر دیا۔ جب سارا معاشرہ اس سے نفرت کرتا تھا تو پولیس کے سپاہیوں کو تو انصاف کرنا چاہیے تھا۔ وہ تو جانتے تھے کہ وہ مکمل طور پر بے قصور ہے۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے اسے جیل کی سلاخوں میں قید کر دیا اور کچھ کھانے کو بھی نہ دیا۔ اگلے دن اُس بے سہارا مجبور نے ظلم سے نجات پانے کے لیے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔

"دیوار" ژاں پال سارتر کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ افسانے کی کہانی کے تین مرکزی کردار جون، ٹام اور پابلو ہیں جو بغاوت اور اسپین کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں قید کر لیے جاتے ہیں انہیں ایک کوٹھڑی میں قید کر کے مقدمہ چلایا جاتا ہے اور موت کی سزا سنادی جاتی ہے۔ یہ افسانہ قید اور قیدی کرداروں کے متعلق بہت اہم ہے۔

سزائے موت کی خبر سنتے ہی جون جو کہ کم سن اور ناتجربہ کار ہوتا ہے اس کی حالت اور دوسرے کردار ٹام اور پابلو ان سب کی حالت خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جون چیختا چلاتا ہے اور وحشت اور خوف سے اس کا چہرہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ رنگ زرد

اور ہونٹ پیلے ہو جاتے ہیں۔ ٹام اور پابلو کی حالت بھی موت کے ڈر کی وجہ سے بدتر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ٹام کو بار بار موت کے خیالات ستاتے ہیں اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے خود کو ادھر اُدھر باتوں میں مصروف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پابلو اور ٹام کا بدن سخت سردی میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا ان کی رنگت پیلی ہو چکی تھی۔ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رہی۔ خوف کی شدت سے نڈھال ہو چکے تھے۔ انہوں نے موت کے خیال کو ٹالنے کے لیے ماضی کی حسین یادوں کو دھیان میں لانے کی کوشش کی لیکن موت کا ڈر سر پر کھڑا تھا۔ ان کا بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا، ہر گزرتا لمحہ ان کو موت کے قریب کر رہا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے گولیاں ان کے بدن سے آر پار ہو گئیں ہیں اور چہروں پر سوراخ بن گئے ہیں۔ موت نے سب چیزوں کی دلچسپی ختم کر دی تھی جہاں تک پابلو کا اپنی محبوبہ کا نشہ سے پیار اور ریمون سے دوستی کی اہمیت تک کو ختم کر دیا تھا۔ اسی دوران ایک ڈاکٹر ان کا چیک اپ کرنے کے لیے کوٹھڑی میں آتا ہے۔ ڈاکٹر ان تینوں سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تینوں کردار ڈاکٹر کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ سچ میں ڈاکٹر زندہ شخص ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو محسوس کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنے جسمانی اعضاء پر کنٹرول تھا اور وہ اپنی زندگی کو آزادی کے ساتھ گزار رہا ہے۔ ڈاکٹر کے مقابلے میں وہ تینوں سائے کی طرح تھے اور اضطراب کا شکار تھے۔ صبح ہوتی ہے تو دو گارڈ جون اور ٹام کو سزا دینے کے لیے لے جاتے ہیں اور گولیاں مار کر ختم کر دیتے ہیں لیکن پابلو کو ایک چوائس دیتے ہیں کہ اگر وہ اپنے دوست ریمون کا پتہ بتا دیتا ہے تو اس کو معافی مل سکتی ہے۔ پابلو ریمون سے غداری نہیں کرنا چاہتا اور فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ایک اچھی باوقار موت مرے گا لیکن پھر سوچتا ہے جب میں مر رہا ہوں تو کسی بھی چیز کی اہمیت نہیں ہے۔ پابلو، ریمون کا غلط پتہ بتا کر وقتی طور پر موت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سپاہیوں کو ریمون قبرستان سے مل جاتا ہے اور وہ اسے گولیوں سے اڑا دیتے ہیں اس طرح پابلو مرنے سے بچ جاتا ہے۔ اسے پابلو کی خوش قسمتی کہہ لیں یا ریمون کی بد قسمتی۔ کیونکہ وہ اپنے دوست سے غداری نہیں کرتا بلکہ ایک چال چلتا ہے جو اُس کو زندگی عطا کر گئی۔ لیکن ایسی زندگی جس میں وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی قید ہے وہ ایک ذہنی بوجھ تلے دب گیا ہے۔ اس سلسلے میں افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”بس میرا جی چاہا تھا کہ ان سے مذاق کروں۔ وہ میرے ہاتھوں بیوقوف بنیں اچھل اچھل کر پیٹیاں کسیں۔ ٹوپیاں سیدھی کریں اور بے معنی احکامات جاری کریں۔۔۔ چند لمحوں کے خاموشی کے بعد گارشیا دبے لہجے میں بولا۔۔۔ ”وہ ریمون کی تلاش میں کامیاب ہو گئے“۔۔۔ ظالموں نے اسے دیکھتے ہی گولیوں سے اُڑا دیا۔۔۔ ہر چیز دائرہ وار گھومنے لگی جب مجھے ہوش آیا تو میں زمین پر بیٹھا تھا اچانک میں اتنے زور سے ہنسا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔“(9)

سارتر کا یہ افسانہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسپین کی آزادی کی تحریک کچلنے کے لیے حکومت نے لوگوں پر مقدمات چلا کر بلاوجہ موت کے گھاٹ اتارا۔ انصاف کے تقاضوں کو بھی پورا نہ کیا۔ اس عدالتی (فوجی) طریقہ کار سے پردہ اٹھاتا ہے۔

سارتر اپنی زندگی میں جنگ کے خلاف تحریکوں میں انتہائی سرگرم رہا اور اپنی زندگی میں فرانس میں طلبہ کی بغاوت کی بھی بھرپور حمایت کی۔ ''دیوار'' کا موضوع بغاوت اور اس کی سزا کے ساتھ ''وجودیت'' کے فلسفے کا پرچار ہے۔

کہانی کا پلاٹ سادہ ہے۔ تین کردار جو بغاوت کی سزا موت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور موت کی وحشت ناک تکلیف اور جسمانی اذیت کا سوچ کر مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ خاص طور پر جون اور ٹام ہر طرح کی ہمت ہار کر موت کی گھڑی کا انتظار کرنے لگے ہیں۔ پابلو بھی انہیں کی طرح سوچتا ہے مگر کہانی کے آخر پر تقدیر کے مقابل تدبیر کامیاب رہتی ہے۔

زندگی میں یہ سوچنا کہ اب تو مر ہی جانا ہے تو سب بدذائقہ ہی لگے گا۔ زندگی کے ہر پل کو زندہ دلی اور مشکل وقت میں مردانگی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ موت کا خوف جذبات کو پہلے ہی مار دیتا ہے اور جذبات کی موت ہی انسان کی موت ہے۔ انسان اپنی محبوب چیزوں کی طرف دیکھنا تو دور کی بات اس کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا کیونکہ وہ انہیں بے کار سمجھتا ہے اور موت کا خوف ان کی دلچسپی دلکشی کو بھی چھین لیتا ہے۔ حالات اور وقت سے ہارا ہوا شخص خود تو قابل رحم ہوتا ہے دوسروں کے لیے بھی حوصلہ شکنی کا باعث بنتا ہے۔ پابلو اپنے دوست ریمون سے لاتعلقی اور اپنی محبوبہ کے متعلق سوچنا چھوڑ دیتا ہے جہاں تک کہ کسی بھی چیز کی اہمیت اس کے نزدیک نہیں ہے۔ اس کی زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے زندگی کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔ وہ ماضی کے حسین پل یادوں کو دھیان میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اب ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس افسانے میں تین حریت پسند قیدی کرداروں کی عکاسی کی گئی ہے۔ جون، ٹام اور پابلو، جو اسپین کی آزادی کی تحریک میں حصہ لیتے ہیں اور اس بغاوت کے جرم میں انھیں گرفتار کر کے قید کر لیا جاتا ہے۔ اب انھیں پتا ہے کہ انھیں صرف موت ہی اس قید سے باہر نکال سکتی ہے اور موت کا خوف وہ اپنے اوپر اس قدر طاری کر لیتے ہیں کہ اُن کا سارا جسم کانپنے لگتا ہے۔ پابلو اور ٹام اپنی قریب آئی موت کی ساخت پر تبالہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے جسم کے اندر گوشت میں پیوست ہونے والی گولیوں کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالتے۔ بہت رونے دھونے کے بعد بھی، ڈرنے کے بعد بھی آخر کار دو قیدیوں جون اور ٹام کو گولیوں سے اُڑا دیا جاتا ہے اور پابلو کو اس شرط پر کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے لیڈر جس کا نام ریمون ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے اس کا پتہ بتا دے۔ اب پابلو کو اس بات کا پتہ ہے کہ وہ اگر اپنے لیڈر کا پتا بتا دے گا تو چھوٹ جائے گا لیکن وہ غداری نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ پتا نہیں بتائے گا اور اس لیے اسے بھی گولیوں سے اُڑا دیا جائے گا۔ لیکن وہ

سوچتا ہے کیوں نہ جانے سے پہلے پولیس والوں کو بے وقوف بناتا چلے۔ وہ اپنے لیڈر ریمون کا پتہ تو بتاتا ہے لیکن غلط اس لیے کہ پولیس والے مغزماری کے بعد تھک جائیں اور غصے سے لال پیلے ہو جائیں اور انھیں اس حالت میں دیکھ کر خوشی اسے محسوس ہو گی لیکن اس کی بد قسمتی کہ اُسے یہ خوشی بہت بھاری پڑتی ہے کہ اس کا لیڈر ریمون اصل جگہ سے نکل کر اُس غلط جگہ، جہاں کا اس نے پولیس والوں کو پتا بتایا ہوتا ہے، وہاں پہنچ جاتا ہے اور اس طرح وہ پولیس کو مل جاتا ہے۔ وہ اسے پکڑ کر وہیں گولیوں سے اُڑا دیتے ہیں۔ ریمون کے ملنے پر پابلو کو پولیس والوں نے چھوڑ دیا وہ آزاد تو ہو گیا لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ضمیر کا قیدی بن گیا۔

''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' انل بروے کا مشہور افسانہ ہے جس کا اُردو ترجمہ شاہد ندیم نے کیا ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک ایسے کردار کی کہانی بیان کی گئی ہے جو قیدی ہے۔ ''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جسے اپنی سزائے موت پر کوئی ملال نہیں ہے۔ مسٹر گیلارڈ راج مہندری جیل کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ اُن کا جیل کے عملے اور قیدیوں پر بہت رعب ہے اور وہ ہر روز رعب قائم کرنے کے نئے طریقے سوچتے ہیں۔ جب وہ جیل میں داخل ہوتے ہیں تو ہر طرف خاموشی اور سکوت کی حالت ہوتی ہے۔ گیلارڈ صاحب اپنی سروس (۲۵) سالہ میں ایک سو گیارہ آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا چکے ہیں۔ تب اُن کی سروس میں ایک پھانسی کا قیدی آتا ہے جسے شری کالوکم کے سیشن جج نے پولیس چوکی توڑ کر سات کانسٹیبلوں اور ایک سب انسپکٹر کو گولی سے اُڑانے کے جرم میں پھانسی کے لیے بھیجا ہوتا ہے۔ اس قیدی کا نام نکسلی (ویر بھوشن پٹنایک) ہے جو کہ ایک کمیونسٹ ہے اور کال مارکس اور لینن کے نظریات کا حامی ہے جو کہ ایک انقلابی گروہ کی رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

پھانسی کی سزا پانے والا کوئی قیدی جیل میں آجاتا تو دوسرے سپریٹنڈنٹ بدحواس ہو جاتے لیکن گیلارڈ صاحب کو ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے کوئی بڑا ڈاکو گرفت میں آگیا ہو۔ کسی کو پھانسی چڑھاتے ہوئے اُنھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک مقدس فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ ایسی ہی خوشی اور جذبات اُن کی نکسلی کی پھانسی کی سزا سن کر ہوئے اور جب اُنہوں نے سنا کہ پھانسی پانے والا مجرم کمیونسٹ ہے تو اُنہیں مزید غصہ آیا۔ چیکنگ کے دوران نکسلی کے پیٹ پر زخم کا نشان دیکھ کر سینسر جیلو اس سے زخم کے متعلق پوچھتا ہے۔ جس پر نکسلی اسے بتاتا ہے کہ یہ زخم تھری ناٹ تھری کی گولی لگنے سے ہوا۔ جس پر سینسر پوچھتا ہے کہ آپریشن کہاں سے ہوا تو نکسلی کہتا ہے کہ وہ خود بہت اچھا سرجن ہے اور اس کے پاس سامان موجود تھا آپریشن اس نے خود کیا۔ یہ سب صورت حال دیکھ کر گیلارڈ میں نکسلی کے لیے تجسس پیدا ہوتا ہے۔ نکسلی کو آٹھ سو بیالیس نمبر الرٹ کر دیا جاتا ہے اور راج مہندری جیل کے پھانسی گھاٹ پہنچایا جاتا ہے جہاں وہ گیلارڈ صاحب کے زیر نگرانی ہوتا ہے۔ نکسلی کے پاس مایاکوفسکی کی شاعری کی کچھ کتابیں بھی ہیں۔ وہ انہیں پڑھتا رہتا ہے۔ اگلے دن مسٹر گیلارڈ نکسلی سے ملتے ہیں اور اس سے مرسی پٹیشن یعنی صدر سے رحم کی اپیل کرنے کے لیے کہتا ہے۔ لیکن نکسلی رحم کی اپیل سے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مسٹر گیلارڈ یہ آپ اپنے پاس رکھیں

میری پھانسی کے بعد آپ کی پروموشن کے کام آئے گی۔ گیلارڈ کو نکسلی کے رویے سے غصہ آتا ہے کہ یہ مجھے صاحب کی بجائے مسٹر گیلارڈ کہتا ہے۔ اس لیے گیلارڈ صاحب شروع میں نکسلی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرتے تھے اور جب نکسلی کی بیوی نکسلی سے ملنے آتی ہے تو اسے گرم دھوپ میں جیل کے باہر انتظار کرنے کو کہتے ہیں۔ گرمی کی شدت سے جب وہ اپنے بچے کے لیے پانی مانگتی ہے تو جمع دار اس کی بے عزتی کرتا ہے اور پانی دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ننگے پیر، پیسوں کی تنگی سے مجبور پیدل آنے والی نکسلی کی بیوی اپنا بچہ آنچل میں چھپائے دھوپ سے بچنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔۔۔ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔۔۔ گرمی سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔۔۔ وہ پانی مانگنے کے لیے مین گیٹ کے نزدیک آئی۔ جمع دار سے پانی مانگا۔۔۔ کھیا کے بولا۔۔۔ جیل ہے سمجھی۔ چل دفعہ ہو جا یہاں سے۔''(10)

بالآخر گیلارڈ صاحب اس کی ملاقات نکسلی سے کروا دیتے ہیں۔ نکسلی اپنی بیوی سے پوچھتا ہے کہ تم میری رحم کی اپیل تو نہیں کر رہی۔ جس پر اُس کی بیوی کہتی ہے کہ میں ظالموں کے سامنے کبھی نہیں جھکوں گی۔ گیلارڈ اُن دونوں کی باتوں سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اسے اپنی بیوی مریم یاد آ جاتی ہے جسے ہٹلر کے چار گسٹاپو گیس چیمبر کی جانب کھینچ رہے تھے۔ گیلارڈ ان کے قدموں میں گر کر لوٹنے لگا۔ گیلارڈ کے سامنے ہمیشہ گردن جھکائے رہنے والی ماریا نے تلملا کر ان کے منہ پر زور دار ہاتھ جمایا اور بولی ''پروا نہیں میری جان چلی جائے، آدمی ہو کر ان ظالموں کے آگے ناک کیوں رگڑتے ہو۔'' یہ پرانی یادیں بھرتے ہی گیلارڈ صاحب کا گلا خشک ہو گیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے تن بدن میں عجیب سی آگ لگی ہوئی ہے۔ گیلارڈ صاحب کے اندر نکسلی اور اس کی بیوی کے لیے رحم کے جذبات پیدا ہونے لگے اور انہوں نے جمع دار کے ذریعے گیلارڈ کی بیوی کی مالی مدد کی اور یہ ارادہ کر لیا کچھ بھی ہو نکسلی کو پھانسی سے بچایا جائے۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے نکسلی کو بہت سمجھایا کہ اپنی بیوی اور بچے کی خاطر ہی رحم کی اپیل پر دستخط کر دے لیکن نکسلی نہ مانا۔ ایک رات گیلارڈ صاحب نشے کی حالت میں نکسلی کے پاس جاتے ہیں اور اسے درخواست پر دستخط کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن نکسلی نہیں مانتا جس پر گیلارڈ صاحب اسے مار مار کر بے ہوش کر دیتے ہیں۔ جس پر نکسلی گیلارڈ صاحب سے کہتا ہے کہ رحم کی اپیل کرنا محنت کش عوام کی ہار ہو گی اور جو انقلاب وہ لانا چاہتا ہے وہ ناکام ہو جائے گا اور بے ضمیری کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ موت کو قبول کیا جائے۔

ایک دن پھانسی گھاٹ کا جمع دار نکسلی کو جنگ کے دوران ایک نوجوان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سناتا ہے جس نے اپنی بیوی کے لیے وصیت لکھی تھی اور نکسلی کو بھی کہتا ہے کہ وہ بھی اپنی بیوی کے لیے کوئی پیار بھرا پیغام یا وصیت لکھے۔ اگلے دن نکسلی اُسے وصیت لکھنے کا کہتا ہے اور یہ وصیت گیلارڈ صاحب کی نگرانی میں لکھی جاتی ہے اور نکسلی درخواست لکھواتا ہے۔ ''ہندوستان کے سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت کے ہر دل عزیز صدر کی خدمت میں جنابِ عالی! راج منہدری جل میں آپ کی حکومت کی جانب سے دی ہوئی سزائے موت کا منتظر قیدی نمبر آٹھ سو بیالیس ایک بار پھر یہ اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں میں کمیونسٹ ہوں، مارکس، لینن اور مایا کوفسکی کے نظریات پر مجھے پورا یقین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کے عوام صرف ایک انقلاب کے ذریعے آپ کی ظالم اور جابر حکومت کا تختہ پلٹ کر نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ میں کمیونسٹ ہوں اور کمیونسٹ عقیدے کے مطابق محنت ہی سے جائیداد بنائی جا سکتی ہے اور محنت کرنے والا یہ جسم بھی انسان کی جائیداد کا ایک حصہ ہے اور یہی میری دولت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے پھانسی دے کر میرے جسم کو نقارہ نہ بنایا جائے بلکہ میرے جسم کے مختلف اعضاء ڈاکٹر کے مشوروں سے کسی غریب آدمیوں میں تقسیم کر دیں جنہیں ان اعضاء کی ضرورت ہو لیکن کسی سرمایہ دار اور بڑے زمیندار کو نہ دیے جائیں۔''

نکسلی کی وصیت سن کر گیلارڈ صاحب نے تسلیم کر لیا کہ نکسلی ایک بڑا انقلابی ہے اور ایسے شاندار انسان ہی تبدیلی لاتے ہیں۔ نکسلی کے نظریات گیلارڈ کو بہت متاثر کرتے ہیں اور وہ نکسلی کو تمام سہولیات فراہم کرتے ہیں اور نکسلی کو اپنی بیٹی جینی سے ملواتے ہیں۔ جینی بچپن سے برلن میں رہتی ہے اور وہاں ہی شادی کر لیتی ہے اور اب ماں بننے والی ہوتی ہے۔ جینی نکسلی کو ایک انقلابی شاعر سمجھتی ہے اور اسے اپنی نظمیں دیکھنے کے لیے دیتی ہے۔ جینی کے دل میں نکسلی کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جینی اپنے باپ سے کہتی ہے کہ نکسلی ایک سپاہی ہے۔ ایک عظیم انقلابی ہے اسے ڈاکوؤں اور مجرموں کی طرح پھانسی نہیں دینی چاہیے بلکہ شان دار موت دینی چاہیے۔ جینی نکسلی سے کہتی ہے کہ تم اگلے جنم میں میرے بیٹے کا جنم لینا کیونکہ میں چاہتی ہوں میرا بیٹا تمہارے جیسا شیر دل اور شاعر ہو۔ جس رات نکسلی کو پھانسی لگنی ہوتی ہے اُس رات موسم خراب ہو جاتا ہے اور تیز بارش شروع ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں شہر سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ جیل کا سرجن آر ایم او شہر سے باہر تھا۔ اُسی رات جینی کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ گیلارڈ صاحب پریشان ہو جاتے ہیں۔ نرس بتاتی ہے کہ اگر آج رات آپریشن نہ کیا گیا تو مریض کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ جب کوئی حل نہیں نکلتا تو نرس گیلارڈ صاحب کو نکسلی کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ مجبوراً نکسلی کو بلایا جاتا ہے اور گیلارڈ صاحب نکسلی سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ جس پر نکسلی کہتا ہے کہ ریوالور چلانا آپ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ نکسلی جینی کا کامیاب آپریشن کرتا ہے اور گیلارڈ صاحب اسے تحفے کی پیش کش کرتے ہیں

تو نکسلی کہتا ہے کہ پھانسی گھاٹ پر دے دینا جو دینا ہو جب نکسلی کو پھانسی گھاٹ کی جانب لے جا رہے ہوتے ہیں تو گیلارڈ صاحب نکسلی کو آواز لگاتے ہیں کامریڈ، کامریڈ!

نکسلی نے جب مڑ کر دیکھا تو گیلارڈ صاحب نے فوراً فائر کر دیا اور نکسلی کو کہا کہ دیکھو میں نے تمہارے سینہ پر گولی چلائی۔ نکسلی ایسی شاندار موت دینے پر زور سے چلایا، تھینک یو مسٹر گیلارڈ۔۔۔ تھینک مسٹر گیلارڈ! اس سلسلے میں ''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''عموماً قیدیوں کو نمبر سے بلانے اور تنگ کرنے والے گیلارڈ صاحب کی زبان سے یہ سن کر نکسلی کو ہنسی آگئی۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور ہوتا، صاحب نے ریوالور اُٹھایا اور فائر کر دیا۔۔۔ گیلارڈ صاحب کی آنکھوں میں التجا تھی، گزارش تھی، وہ کہہ رہے تھے ''کامریڈ! میں نے تمہارے سینے پر گولی ماری پیٹھ پر نہیں۔''(11)

اگلی صبح گیلارڈ صاحب کو نکسلی کو قتل کرنے کے جرم میں جیل منتقل کر دیا گیا لیکن آج انھیں کسی جمع دار نے سلیوٹ نہ کیا جس سے گیلارڈ صاحب کو مایوسی ہوئی لیکن انھیں محسوس ہوا کہ جیل کی دیواریں جھک کر کہہ رہی ہیں۔

''تھینک یو مسٹر گیلارڈ۔۔۔ تھینک یو مسٹر گیلارڈ۔''

اِنل بروے نے بھی اپنے دور کے درپیش مسائل کی عکاسی اپنی تخلیق کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انہیں غریب عوام سے ہمدردی ہے۔ چاس نالا میں کوئلے کی کان میں پیش آنے والے سانحے پر بھی تفتیشی رپورٹ ''گیارہ کروڑ گیلن پانی'' پیش کی جس میں غریب مزدوروں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی ہے اور اس طرح اپنے انقلابی خیالات انل بروے نے اپنے افسانے ''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' میں ظاہر کیے ہیں جو کہ ایک ایسے آدمی کی کہانی جو کہ انقلابی ہے اور مارکس، لینن اور مایاکوفسکی کے نظریات کا قائل ہے۔ غریب معاشرے کے لیے آواز بلند کرنے پر اُسے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح اُس میں انقلابی تحریک چلانے والوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے تھے پھر بھی وہ اپنے عقیدے پر قائم تھے۔ اُن کے گھر والوں کو کتنی دشواریاں پیش آتی تھیں، جس کی مثال اُس نے نکسلی کی بیوی کے ذریعے دی ہے کہ کس طرح پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ سو میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے نکسلی سے ملنے آتی ہے، لیکن اُسے گرم دھوپ میں انتظار کروایا جاتا ہے اور پانی تک نہیں دیا جاتا۔ یہاں پر مصنف نے انسانیت کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا، اُسے بیان کیا ہے۔

دراصل ماضی میں پیش آنے والا کوئی واقعہ انسان کے دوسروں کے ساتھ رویہ بدل دیتا ہے اور وہ انتہا پسند رویہ اور خیالات کو جنم دیتا ہے۔ جس طرح گیلارڈ صاحب کی بیوی کے ساتھ ہٹلر کے لوگوں نے سلوک کیا اس سے گیلارڈ صاحب کے دل

میں انسانیت انتہا پسند خیالات نے جنم لیا۔ دوسری طرف نکسلی ہے جس کے اندر انسانیت کے لیے رحم کے جذبات ہیں اور وہ غریبوں اور محنت کشوں کے لیے اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر یہ جنگ لڑ رہا ہے۔ نکسلی سے متاثر ہو کر گیلارڈ صاحب کے انتہا پسندانہ جذبات رحم کے جذبات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کمیونزم کے بانی کال مارکس کا یہ خیال تھا کہ مذہب ایک افیون ہے جو کہ ہمیں ایک خاص قسم کے جذبات میں الجھائے رکھتا ہے اور ارد گرد کے زندگی کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت ختم کر دیتا ہے۔ نکسلی بھی انہی خیالات کا قائل ہے۔ اس لیے گیلارڈ صاحب نے اُس کے لیے کچھ مذہبی کتابیں تجویز کیں تا کہ وہ پھانسی کے وقت دل برداشتہ نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن انسان کو روحانی طور پر مضبوط کرتا ہے۔ لیکن یورپ کے انقلابیوں نے جو نظریات پیش کیے اس سے لوگ مذہب سے دور ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے اندر انسانیت کے لیے جذبات بھی تھے اور وہ مذہب کی اہمیت بھی سمجھتے تھے اور جینی بھی ان لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسے نکسلی کے انقلابی نظریات بھی متاثر کرتے ہیں۔

اِنل بروے کا یہ افسانہ ''تھینک یو مسٹر گیلارڈ'' دراصل اُن حالات کی عکاسی کرتا ہے جو اس دور میں درپیش تھے اور ان تحریکوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اس وقت عروج پر تھیں اور ان یورپی نقادوں کے نظریات کی جھلک ہے جن سے پوری دنیا متاثر ہو رہی تھی اور ان کے اثرات مختلف پہلوؤں یعنی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حوالے سے ادب پر ہو رہے تھے۔ دراصل یورپی تحریکوں نے دنیائے ادب کے مقاصد کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ جہاں رومانوی قصے کہانیاں لکھے جاتے تھے وہاں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا جانے لگا اور غریبوں اور محنت کشوں کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان تحریکوں کے مثبت اثرات بھی تھے لیکن بہت حد تک انسان کے مذہبی نظریات کو متاثر بھی کرتے تھے۔ اس افسانے میں مذہب میں جو ذات پات کا نظام ہے اس پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں انسانی رویوں میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کے دوسروں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اُن پر بھی تنقیدی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے۔

یہ افسانہ اُس دور کی عکاسی کرتا ہے جس وقت ہندوستان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھیں انسایت سے ہمدردی تھی اور وہ نیا نظام چاہتے تھے اور جبر آزاد ہونا چاہتے تھے لیکن وہ حکومت کے ماتحت تھے اور مجبور تھے اس لیے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

مصنف کے نزدیک انقلاب ایک شخص کی کوششوں سے نہیں آتا بلکہ اجتماعی کوششوں سے آتا ہے۔ جب تک عوام بیدار نہ ہو گی اس طرح ظلم و جبر ہوتے رہیں گے۔ جس طرح یورپ میں انقلاب لایا گیا اس طرح یہاں بھی نیا نظام قائم ہو سکتا

ہے لیکن اس کے لیے جدوجہد اور انسان کے اندر کا ضمیر زندہ ہونا ضروری ہے جب کسی قوم کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے تو اسے کسی بھی کنواں میں دھکیل دو اُس کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ اس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ہے وہی قومیں اپنی حالت بدلتی ہیں جن کا ضمیر زندہ رہتا ہے اور ملامت کرتا ہے۔

افسانہ نگار نے اس افسانے میں ایک ایسے بہادر اور انقلابی قیدی کے کردار کو واضح کیا ہے جسے صرف غریب عوام کی فکر تھی جو انقلاب چاہتا تھا۔ جیل میں بہت دیر قید رہنے، جیل کی سختیاں برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ مسٹر گیلارڈ کی مار بھی برداشت کی لیکن پھر بھی وہ ظالموں کے آگے جھک کر رحم کی اپیل کروا کے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اسے عوام پیاری تھی غریب لوگوں سے اُلفت تھی اپنی جان کی کوئی پروانہ تھی کیونکہ وہ ایک انقلابی قیدی تھا۔

حوالہ جات

۱۔ انتون چیخوف، چیخوف کے بے مثال افسانے، مرتب: ڈاکٹر پروین کلّو، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۵۶۔۵۵

۲۔ ایضاً، ص ۴۹

۳۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۔ ایضاً، ص ۵۴

۵۔ گائے ڈی موپساں، خواب گاہ (موپساں کی منتخب کہانیاں)، مرتب و مترجم: ڈاکٹر ریاض قدیر، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۶۵

۶۔ ایضاً، ص ۶۵۔۶۴

۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۸۔ ایضاً، ص ۶۸

۹۔ ژاں پال سارتر، دیوار، مشمولہ: سب رنگ، کراچی: شمارہ نمبر ۱۲۴۔۱۲۳، ص ۴۶۴

۱۰۔ انل بروے، تھینک یو مسٹر گیلارڈ، مترجم: شاہد ندیم، مشمولہ: سب رنگ، ص ۳۴۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۷۰۔۳۶۹